Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:3 (1968)

وحی الٰہی اور نبوّت

ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

ابتدائے اسلام سے ہر مسلمان کا عقیدہ رہا ہے، اور اس کا یہ عقیدہ ہونا بھی چاہیئے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس مرکزی عقیدے کے بغیر کوئی شخص نام کا بھی مسلمان نہیں ہو سکتا. لیکن اس کے باوجود یہ بحث ہمیشہ سے ہی اسلام میں رہی ہے کہ اللہ کا یہ کلام رسالت مآب علیہ الصّلوٰۃ والسلام پر کس طرح نازل ہوا. وہ لوگ جو اسلام کی مذہبی تاریخ سے سرسری طور پر بھی واقف ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ اس سوال نے سب سے پہلے یہ تشکل اختیار کی تھی :- آیا قرآن، جہاں تک کہ اس کے اللہ کا کلام ہونے کا تعلق ہے، غیر مخلوق اور اللہ کی قدیم و ازلی صفت ہے، یا یہ مخلوق ہے اور یہ اللہ کی قدیم و ازلی صفت نہیں. معتزلہ مکتبِ فکر کا یہ عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ اللہ کی قدیم و ازلی صفتِ کلام نہیں۔ قرآن کے بارے میں معتزلہ کا یہ عقیدہ اس بنا پر تھا کہ وہ اللہ کے سوا اُس کی کسی صفت کو قدیم و ازلی نہیں مانتے تھے۔

(۲) راسخ العقیدہ علماء نے جن کی قیادت امام احمد بن حنبل نے کی، اس خیال کی بڑی سختی سے مخالفت کی اور آخر کار وہ اس عقیدہ کو منوانے میں کامیاب ہو گئے کہ قرآن غیر مخلوق ہے اور وہ من جملہ اللہ کی قدیم و ازلی صفات میں ہے. قرآن مجید کو غیر مخلوق تو منوا لیا گیا، لیکن اب راسخ العقیدہ علماء کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ وہ اس امر کا تعین اور اس کی وضاحت کریں کہ کس طرح اللہ کی ایک قدیم و ازلی صفت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس مقصد کے لئے اتصال ہوا کہ اس کا آپؐ پر نزول ہو۔ راسخ العقیدہ گروہ کے عظیم سربراہوں کو، جیسا کہ امام ابوالحسن الاشعری اور دوسرے تھے، بالآخر یہ کہنا پڑا کہ "قرآن جس طرح کہ یہ پڑھا جاتا، سنا جاتا اور دیکھنے میں آتا ہے، اللہ کا کلام نہیں ہے"۔ انھوں نے واضح طور پر اس امر کی صراحت کی کہ اللہ کا جو کلام قدیم و ازلی ہے، وہ اس کا "کلامِ نفسی" ہے، جس کے کہ قرآن اور دوسری نازل شدہ کتابیں آثار ہیں۔ اور یہ کہ قرآن اس سلسلۂ نزول کی سب سے آخری کتاب ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے سترھویں صدی عیسوی میں اس بارے میں

راسخ العقیدہ سنی نقطۂ نظر کا ایک پہلو اپنے اس شعر میں یوں بیان فرمایا ہے :۔

والله کلامِ حق کہ علی الحق یک است و بس
پس در نزول مختلف آثار آمدہ

(خدا کی قسم ۔ کلامِ حق فی الحقیقت صرف ایک ہے ۔ پس نزول میں وہ مختلف الآثار ہو گیا)

حضرت مجدد نثر میں اس کی توضیح یوں فرماتے ہیں :۔ "وہمچنیں یک کلام بسیط است کہ از ازل تا ابد بہمان یک کلام گویا است ۔ اگر امر است از ہماں جا ناشی است ، اگر نہی است ہم از آنجا ، اگر اعلام است ہم از آنجا ماخوذ است ، و اگر استعلام است ہم از آنجا ، اگر تمنی است ہم از آنجا مستفاد است ، و اگر ترجی است ہم از آنجا ، جمیع کتب منزلہ و صحف مرسلہ ورقی است از آن کلام بسیط ۔ اگر توریت است از آنجا انتساخ یافتہ است ، و اگر انجیل است ہم از آنجا صوت لفظی گرفتہ است ۔ و اگر زبور است ہم از آنجا مسطور گشتہ و اگر فرقان است ہم از آنجا تنزل فرمود"

(۳) یہ تو ہوا ۔ لیکن اس طرح یہ جو مسئلہ پیش ہوا ، اور اسے حل کیا گیا ، تو یہ پوری طرح اطمینان بخش ثابت نہ ہوا ۔ درحقیقت یہ اندازِ بحث بہت زیادہ مجرد اور متکلمانہ تھا ۔ چنانچہ علامہ اقبال نے ارمغان حجاز میں اس کا یوں مذاق اڑایا ہے :۔

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات ؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

(۴) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی کتاب "فیوض الحرمین" میں فرماتے ہیں :۔ "شریعتوں کے احکام و قواعد کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے ۔ اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے ۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے ۔ اب جو عادتیں بُری ہوتی ہیں ، ان کو تو ترک کرنے کا حکم دیا جاتا ہے ۔ اور جو عادتیں اچھی ہوتی ہیں ، ان کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے ۔ یہی کیفیت "وحی متلو " کی ہے ۔ یہ وحی ان الفاظ ، کلمات اور اسالیب میں جو خود صاحبِ وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں ، صورت پذیر ہوتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں وحی کی۔ سریانی بولنے والوں کے لئے سریانی میں۔۔۔"
شاہ صاحب کے اس بیان سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید ان الفاظ، کلمات اور اسالیب میں نازل ہوا، جو رسول اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے ذہن میں پہلے سے، یعنی بعثت سے پہلے بھی موجود تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اپنی فارسی کتاب "سطعات" میں اس کی مزید وضاحت یوں فرماتے ہیں:۔"تدبیر الٰہی جو صالح ترین کے انتخاب پر مبنی ہے، ایک زمانے میں اس کی مقتضی ہوئی کہ وہ افراد انسانی میں سے ایک فرد کامل کو اپنا واسطہ بنائے اور اس کے ہاتھ سے اپنے مقصود کی تکمیل کرے۔ پس یہ ارادہ بعینہٖ اس فرد کامل کے حجر بحت (دل کا اعلیٰ حصہ) میں اس طرح انطباع پذیر ہو جاتا ہے، جیسے سورج کی ہیئت آئینہ میں۔ اس وقت اس کی قوائے قلبی و عقلی حجر بحت کے نور سے منور ہو جاتی ہیں۔ اور بہت سے علوم اور بے شمار ارادے اس پر نازل ہوتے ہیں۔ اسے ملاء اعلیٰ سے عجیب مناسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس فرد کامل کے دل پر بارش کی طرح علوم شرائع وحکم اترتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ سے کارہائے مطلوب سرانجام پاتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں: ونام ایں عزیز رسول باشد۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔"بعض دفعہ ارادۂ الٰہی اس امر کا مقتضی ہوتا ہے کہ افرادِ بنی آدم کے ہر طبقے کو اور ان کے تمام دُور و نزدیک والوں کو ہمیشہ ہمیشہ ہدایت ملتی رہے، تو اس کے لئے فیضِ الٰہی نفس پیغامبر کو مسخر کرتا ہے اور اس کے حجر بحت میں کتاب اللہ کو اجمالاً اس صورت میں نازل فرماتا ہے، جس میں وہ حظیرۃ القدس میں ہوتی ہے۔ اس بنا پر اسے اس کے کلام اللہ ہونے کا قطعی علم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کے واسطے سے اس کے قوائے عقلیہ میں دفعتہً بعد دفعتہً منظم کلام اترتا ہے۔ فرمودہ ربّانی ہے۔ انزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين۔ اور اس حالت میں اس پر خزائن رحمت سے فیضِ الٰہی سیلاب کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ اور یہ نازل ہونے والی کتاب اللہ ہوگی۔"

(۵) اب ہم اس نقطہ پر پہنچ گئے ہیں، جہاں کہ طریقہ وحی کے مسئلے کو نفسیاتی اصطلاحات میں زیر بحث لایا گیا اور اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں یہاں بڑی صراحت سے بتایا گیا ہے کہ کتاب اللہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دل پر نازل کی گئی ہے، جہاں سے دفعتہً بعد دفعتہً اُن الفاظ، کلمات اور اسالیب میں جو پہلے سے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، یہ کلام منظم کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہاں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر الفاظ، کلمات اور اسالیب پہلے سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذہن

میں موجود تھے، تو پھر یہ کیسے قدیم و ازلی، خدا کا اور غیر مخلوق کلام ہو سکتا ہے ؟ - اور یہ کہ کلام اللہ، رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر محض الہامی صورت میں اُترنے کے بجائے کس طرح خاص قرآن کے الفاظ خدا کی طرف سے وحی کردہ ہو سکتے ہیں ؟ -

علامہ اقبال ؒ نے "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے پہلے خطبے میں اس سوال پر مختصراً بحث کی ہے۔ یہاں میں اُس میں سے اقتباس دے رہا ہوں:-

"........ لیکن ہمارے دوسرے احساسات کی طرح صوفیانہ احساس میں بھی تعقل کا ایک عُنصر شامل رہتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں یہی مشمول تعقل ہے جس سے بالآخر اس میں فکر کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ دراصل احساس کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اس کا اظہار فکر کے پیرائے میں کیا جائے معلوم ہوتا ہے، دونوں کا تعلق ہمارے داخلی مشاہدات کی کسی ایک ہی وحدت سے ہے۔ فکر اس کا زمانی پہلو ہے۔ احساس لازمانی۔"

سلسلہ بحث کو جاری رکھتے ہوئے علامہ اقبال ؒ پروفیسر ہاکنگ کا یہ حوالہ دیتے ہیں:-

" احساس سے الگ وہ غیر احساس کیا ہے، جہاں اس کا خاتمہ ہو گا؟ میرا جواب ہے، کسی چیز کا شعور۔ اس لئے کہ احساس کا مطلب ہے کسی صاحبِ شعور ہستی کی بے قراری جس میں قرار پیدا ہو گا۔ تو اس شے کی بدولت جو اندرونِ ذات کی بجائے اس سے باہر موجود ہے۔ احساس گویا خارج کی طرف کھنچتا ہے، جیسے فکر اس کی استطلاع۔ لہٰذا کوئی احساس ایسا کور نہیں جو اپنے مقصد سے بے خبر ہو۔ ادھر ہمارے ذہن میں احساس کی کوئی کیفیت طاری ہوئی، اور اُدھر اس شے کا خیال بھی ایک جزوِ لازم کی طرح اس میں شامل ہو گیا جس سے اس کو تسکین ہو گئی۔"

(۶) پروفیسر ہاکنگ کا یہ اقتباس دینے کے بعد علامہ اقبال ؒ اُس پر یوں رائے زنی فرماتے ہیں:-

"........ پھر پروفیسر ہاکنگ کی اس عبارت سے بھی جو ابھی پیش کی گئی، یہی ثابت نہیں ہوتا کہ مذہب کے اندر فکر بھی شامل رہتا ہے۔ اس سے کچھ اور حقائق بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ احساس اور فکر میں چونکہ ایک نامی رشتہ کام کر رہا ہے، لہٰذا یوں وہ قدیم نزاع بھی جس کا تعلق وحی باللفظ سے تھا، اور جس نے ایک زمانے میں اہلیین اسلام کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈال رکھا تھا، حل ہو جاتا ہے۔ غیر واضح احساس کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنا اظہار فکر کے

پیرائے میں کرے۔ رہا فکر سو وہ خود اپنے وجود سے اپنا مرئی پیکر تلاش کر لیتا ہے۔ لہذا یہ کہنا کوئی استعارہ نہیں کہ فکر اور لفظ بیک وقت احساس کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ منطقی فہم ان کی زمانی ترتیب کو دیکھتا اور یوں انہیں ایک دوسرے سے الگ ٹھہراتے ہوئے اپنے لئے طرح طرح کی مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔ بہرحال ایک معنی میں الفاظ وحی ہوتے ہیں۔" ——— (اردو ترجمہ سید نذیر نیازی)

(۷) علامہ اقبالؒ کے ان جملوں سے نمایاں طور پر واضح ہوتا ہے کہ نفسیاتی اعتبار سے احساس، فکر اور لفظ ایک نامیاتی وحدت ہیں اور یہ تینوں بیک وقت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذہن میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس احساس، فکر اور لفظ کے مختلف الاجزاء مرکب کی اصل نبیؑ کے اختیار سے ماوراء ہوتی ہے اور اس کی نوعیت ایک تخلیقی عمل کی ہے۔ اس لئے اسے کسی ایسے منبع و مصدر سے فیضانِ وحی سمجھنا ہوگا، جو خود نبیؑ کی ذاتِ اقدس سے ماوراء ہے۔ بہرحال یہاں علامہ اقبالؒ کی اس مخصوص تشریح سے جو انہوں نے وحی کے بارے میں دی ہے، ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(۸) جہاں تک کہ تمام الہام کردہ مدرکات اور ذہن کے جملہ تخلیقی اعمال کا، جن میں ایک شاعر، ایک فن کار اور یقیناً ایک صوفی، سب شامل ہیں، تعلق ہے، ان تمام پر اس نظریہ کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے۔ بے شک اس کا ان تمام تخلیقی علم و معرفت کے اعمال پر صحیح اطلاق ہوگا، جہاں علم و معرفت کے ایک نادر و بدیع اور بالکل نئے جزو کا انکشاف ہوتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پہ آئن سٹائن کا نظریہ اضافت ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر تمام کی تمام علم و معرفت اُس شخص کو جسے یہ ملتی ہے، ایک لحاظ سے ایسے منبع و مصدر سے عطا کی جاتی ہے، جو معمولاً اُس کے دائرۂ اختیار سے ماوراء ہے۔

بہرحال اب سوال یہ ہے:۔ اگر یہ بات ہے تو پھر قرآنی وحی کی کیا امتیازی خصوصیت ہے، جو اُسے نادر و بدیع علم و معرفت کے انکشاف کی تمام دوسری صورتوں سے، جن میں صوفیانہ علم و معرفت بھی شامل ہے منفرد و ممتاز کرتی ہے۔

(۹) اس ضمن میں مَیں نے اپنی انگریزی کتاب "اسلام" کے دوسرے باب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ دراصل کوشش ہے اسی خاص سوال کا جواب دینے کی، جو علامہ اقبالؒ کے مذکورہ بالا جملوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر قرآن مجید ایک بے مثال وحی ہے، تو اُسے لازماً نادر و بدیع علم و معرفت کے انکشاف کی دوسری

صورتوں سے ممتاز ہونا چاہیئے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا، البتہ اس بارے میں اُنہوں نے چند اشارے کیئے ہیں اور مزید غور و فکر کے لیئے راہ سجھائی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ اسی خاص سلسلۂ استدلال کو اور آگے بڑھایا اور اس کی قدرے تکمیل کی ہے تاکہ میں وحی باللفظ کا، جو عبارت ہے قرآن مجید سے، عدیم المثال اور بے نظیر ہونا ثابت کر سکوں۔

یہاں میں اپنی کتاب "اسلام" سے اقتباس پیش کرتا ہوں:۔

"خود قرآن مجید اپنی نظر میں اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لئے اللہ کا کلام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ کے، جو قطعی طور سے اس دنیا سے ماوراء ہے، رسول ہیں (ہم قطعی طور پر اس ماوراء ہونے کے مفہوم کو زیادہ تعین سے واضح کرنے کی ابھی کوشش کریں گے)۔ آپؐ کو اس پر اتنا یقین تھا کہ آپؐ نے اپنے اس شعور کی بنیاد پر حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے پیغمبروں کے بارے میں یہودی و مسیحی روایات کے بعض بڑے بنیادی تاریخی دعووں کو مسترد کر دیا۔ اس 'ماوراء وجود' نے بعض ذرائع سے، بحیثیت ایک کامل و اعلیٰ مقتدر کے، قرآن مجید کا القاء فرمایا۔ زندگی کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی یہ آواز نہایت واضح قطعی طور پر، بغیر کسی غلطی کے پورے تحکم وجلال کے ساتھ گویا ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ قرآن کا خود لفظ، جس کے معنی "قرأۃ" یعنی پڑھنے کے ہیں، بڑی صراحت سے بتاتا ہے، بلکہ خود قرآن کا متن متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کرتا ہے کہ قرآن لفظاً نہ کہ محض معناً بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔ اس طرح کے نزول کے لئے قرآنی اصطلاح 'وحی' ہے، جو بہت حد تک اپنے مفہوم میں الہام سے نزدیک ہے، بشرطیکہ اس آخر الذکر یعنی 'الہام' سے یہ مراد نہ ہو کہ اس میں لازماً الفاظ نہیں ہوں گے۔" (ص ۳۰-۳۱)

"مزید برآں جہاں تک عام شعور کا تعلق ہے، یہ غلط خیال ہے کہ احساسات اور تصورات اس شعور میں تیرتے پھرتے ہیں اور اُنہیں میکانکی طور پر الفاظ کا لباس پہنایا جا سکتا ہے۔ احساسات، تصورات اور الفاظ کے درمیان یقیناً ایک نامیاتی و فطری رشتہ پایا جاتا ہے۔ الہام حتیٰ کہ شاعرانہ الہام میں بھی یہ رشتہ اتنا مکمل ہوتا ہے کہ احساس، فکر، لفظ سب مل کر ایک مختلف الاجزاء مرکب بن جاتا ہے جس کی کہ خود اپنی زندگی ہوتی ہے۔" (ص ۳۳)

(۱۰) یہاں تک تو میں نے ذہن کے تخلیقی عمل کی نفسیات کی وہی روئداد بیان کی ہے، جو علامہ اقبالؒ پیش کر چکے ہیں۔ اس روئداد سے صاف ظاہر ہوتا ہے جہاں اس تخلیقی عمل کا منبع و مصدر اور اُس کی اصل اُس شخص کے عام دائرۂ اختیار سے، جو اس تخلیقی عمل کا انسانی واسطہ بنتا ہے، ماوراء ہوتی ہے، وہاں اس کے باوجود یہ تخلیقی عمل بعض معین اعتبار سے اس انسانی واسطہ کا ایک اہم جزو بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ پورے کا پورا تخلیقی عمل اس انسانی واسطہ کے ذہن میں ہوتا ہے، تو اس صورت میں عام معنوں میں، جہاں تک کہ نفسیاتی عمل کا تعلق ہے، اس تخلیقی عمل کے نتیجے میں نکلنے والے الفاظ اُس انسانی واسطے کے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک ان الفاظ کے منبع و مصدر اور اصل کا تعلق ہے، جو کہ اس انسانی واسطے کے دائرۂ اختیار سے ماوراء ہے۔ وہ الفاظ وحی ہوں گے۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے، میں بعینہٖ وہی دُہرا رہا ہوں، جو علامہ اقبالؒ اور شاہ ولی اللہؒ کہہ چکے ہیں۔

(۱۱) لیکن قرآنی وحی کی اس نفسیاتی روئداد سے ساری بات پوری نہیں ہوتی۔ اور نہ وحی الٰہی سے جو مراد ہے، یہ بیان کر دینے سے اُس کا پورا مقصود ادا ہوتا ہے۔ وحی کی صرف نفسیاتی روئداد بیان کر دینے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم قرآن کی وحی کو بھی اُسی زمرے میں شامل کر دیتے ہیں، جس میں شاعرانہ، فنکارانہ اور صوفیانہ الہام آتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں تو پھر ہم قرآنی وحی کا خالص الٰہیاتی کردار اور اُس کا عدیم المثال ہونا کیسے ثابت کریں۔ اس سلسلے میں میں نے جو دلائل دیئے ہیں، وہ میں اپنی کتاب "اسلام" سے نقل کرتا ہوں:-

"ہم بڑے واضح طور پہ پچھلے باب میں اس امر کی صراحت کر آئے ہیں کہ قرآن کا بنیادی روحانی محرک اخلاقی ہے۔ اور اسی سے اس کا توحید اور ساتھ ساتھ اجتماعی عدل پہ زور دینے کا سوتا پھوٹتا ہے۔ اخلاقی قانون غیر متغیر ہے، یہ امر اللہ ہے۔ انسان نہ تو اخلاقی قانون بنا سکتا ہے، اور نہ اُسے ختم کر سکتا ہے۔ انسان کو اسے تسلیم کرنا چاہیئے، اُس کا اِس طرح اِسے تسلیم کرنا "اسلام" کہلاتا ہے، اور اس کو زندگی میں عملی شکل دینا "عبادت" ہے۔

"قرآن نے چونکہ اخلاقی قانون پہ سب سے بڑھ کر زور دیا ہے اسی لئے قرآن کا خدا بہت سے لوگوں کو مقدماً خدائے عدل نظر آتا ہے، لیکن اخلاقی قانون اور روحانی قدروں پہ اگر عمل ہونا ہے تو لازمی ہے کہ انہیں جانا جائے۔

"اب صورتِ حال یہ ہے کہ چیزوں کا عارفانہ ادراک کرنے کی استعداد میں لوگوں میں واضح طور سے غیر معین انداز کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مزید برآں اخلاقی و مذہبی ادراک خالص عقلی ادراک سے بھی بہت زیادہ مختلف ہے۔ کیوں کہ اوّل الذکر کا اصلی و ذاتی وصف یہ ہوتا ہے کہ یہ ادراک کے ساتھ "سنجیدگی" کا غیر معمولی احساس ساتھ لاتا ہے، اور ادراک کرنے والے کو نمایاں طور پر تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر ادراک نیز اخلاقی ادراک کے بھی درجے ہیں۔ اس میں صرف مختلف افراد ہی میں اختلاف نہیں ہوتا، بلکہ اس نقطۂ نظر سے ایک ہی معین فرد کی داخلی زندگی مختلف اوقات میں مختلف ہو جاتی ہے۔

"اب نبیؐ ایک ایسی شخصیت ہوتی ہے جس کا عام معیاری مجموعی کردار، جو اُس کے عملی اطوار و اخلاق کا پورا خلاصہ ہوتا ہے۔ کہیں زیادہ اعلیٰ و برتر ہوتا ہے عام انسانیت کے کرداروں سے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہوتی ہے، جو روزِ اوّل سے لوگوں بلکہ اُن کے اکثر معیاری نصب العینوں کے بارے میں بڑی بے تاب ہوتی ہے، اور تاریخ کی نئی تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ اسی بنا پر مسلم راسخ العقیدگی نے منطقی طور پر صحیح نتیجہ نکالا کہ پیغمبروں کو سنگین قسم کی غلطیوں سے لازماً معصوم ماننا چاہیئے (یہی عصمت انبیاء کا عقیدہ ہے)۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شخصیت تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شخصیت صرف وہی تھے، جس سے کہ صحیح معنوں میں تاریخ واقف ہے۔ اسی لئے آپؐ کا مجموعی اُسوہ مسلمانوں کے نزدیک "سنت" یا ایک مثالی نمونہ ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایسے لمحات بھی آتے تھے، جب کہ آپؐ، جیسے کہ عام طور پر ہوتا تھا، اپنے آپ سے پرے اور اپنی ذات سے ماوراء رفعتوں میں پہنچ جاتے تھے اور آپؐ کا اخلاقی عارفانہ ادراک اتنا تیز اور شدید ہو جاتا کہ آپؐ کا شعور اور خود اخلاقی قانون ایک ہو جاتے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔ وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلنٰہ نوراً نھدی بہ من نشاءُ من عبادنا۔ (۴۲ - ۵۲)۔ (اور اسی طرح ہم نے تمہیں اپنے امر کی روح کی وحی کی، تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان کو۔ لیکن ہم نے اس کو نور بنایا کہ ہدایت دیں اس سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں)۔ لیکن آخر اخلاقی قانون اور مذہبی اقدار اللہ کا امر ہی تو ہیں۔ اور گو وہ پوری طرح اللہ کی عین نہیں، لیکن بہر حال وہ اُس کا حصہ تو ضرور ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن خالصاً الٰہی

ہے اور اللہ کا کلام ہے ...."

"جب رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اخلاقی وجدانی ادراک ترقی کر کے بلند ترین درجے پر پہنچ جاتا تھا اور وہ خود اخلاقی قانون کا عین بن جاتا (بے شک ایسے لمحات میں بعض معاملات میں خود آپؐ کا اپنا عمل اور برتاؤ قرآن کی تنقید کا نشانہ بنتا) تو الہام کے ساتھ الفاظ کا بھی نزول ہوتا چنانچہ اس لحاظ سے قرآن جہاں خالصاً الٰہی کلام ہے، لیکن بے شک اس کے ساتھ ساتھ وہ اُسی قدر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس سے بھی لاینفک ربط رکھتا ہے۔ اور قرآن کے ساتھ آپؐ کی ذاتِ اقدس کے ربط کا تصور میکانکی طور پر اس طرح نہیں کیا جاسکتا، جیسے کہ فونوگراف اور ریکارڈ کا ربط ہے۔ اللہ کے کلام کا سوتا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب سے پھوٹا ہے۔ (ص ۳۲ - ۳۳)

(۱۲) - باقی رہا یہ امر کہ قرآنی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اور ذہن میں وقوع پذیر ہوتی تھی، خود قرآن مجید نے اس کا اثبات کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:- وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین - ۲۶ - ۱۹۴ - (یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ الروح الامین اسے لے کر تیرے دل پر اُترا ہے تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو)۔ اسی طرح دوسری سورت کی ستانویں آیت میں ارشاد ہوا ہے:- قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علیٰ قلبک (کہہ دو کہ جو جبرئیل کا دشمن ہے۔ (سو ہوا کرے)۔ پس وہی ہے جس نے اس کلام کو تمہارے دل پر نازل کیا)۔

(۱۳) غرض قرآن مجید کی بذریعہ وحی نازل ہونے کی امتیازی خصوصیت کے اثبات کے سلسلے میں میرے استدلال کے دو حصے ہیں۔ اس کے پہلے حصے میں اس سے زیادہ میں نے اور کچھ نہیں کیا کہ اس بارے میں شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ نے عملِ وحی کی نفسیاتی لحاظ سے جس طرح تعبیر کی ہے، میں نے اُن کے بیان سے اتفاق کیا ہے۔ یہ بیان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تمام تخلیقی علم و معرفت اور بالخصوص وحی کے معاملے میں افکار اور الفاظ نبیؐ کے ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ چونکہ یہ افکار اور انکشافات نادر و بدیع اور بالکل نئے ہوتے ہیں، اس لئے اُن کے منبع و مصدر کا محل وقوع نبیؐ کا ذہن نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کا سراغ نبیؐ کی ذات سے ماوراء کسی اور منبع و مصدر میں لگانا ہوگا اور ان افکار و الفاظ کو اُسی سے منزل ماننا ہوگا۔

تاہم جب افکار اور الفاظ نبیؑ کے ذہن میں اُس کے اپنے ایک تکمیلی عمل کے طور پر جنم لیتے ہیں، تو یہ الفاظ عام اعتبار سے اِس انسانی واسطے یعنی نبیؑ کے ذہن کی طرف بھی منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ تو اس معاملے میں، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، اس حد تک گئے ہیں کہ اُنہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ الفاظ، کلمات اور اسالیب پہلے سے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذہن میں موجود تھے۔ اور علامہ اقبالؒ جب یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کے شعوری عمل و اختیار کے بغیر، جن پر کہ وحی اُترتی تھی، الفاظ کے ساتھ ہی افکار وجود میں آ جاتے تھے، تو اس ضمن میں وہ اور بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ میں نے اس میں علامہ اقبالؒ سے اتفاق کیا ہے۔

(۱۴)۔ میرے استدلال کا دوسرا حصہ یہ ہے۔ جہاں علامہ اقبالؒ نے باقاعدہ طور پر وضاحت نہیں فرمائی میں نے قدرے تفصیل سے وحی الٰہی کی عدیم المثال حیثیت کو تخلیقی علم و معرفت کی دوسری صورتوں سے نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ ایسا کرنا بہت ضروری تھا، ورنہ قرآنی وحی کا شمار بھی شاعری اور دوسرے تخلیقی فنون کے زمرے میں کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ نفسیاتی لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ایک ہی تخلیقی الہام کے مُدرک یا مظہر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے والے درجے ہیں، لیکن قرآن اپنی مذہبی و اخلاقی اہمیت اور قدر و قیمت کے اعتبار سے تخلیقی تفکر یا تخلیقی فن کی ہر قسم کی صورت سے کلیتہً جدا اور ممتاز ہے۔

میرے نزدیک اِس دَور کے سوچنے والے آدمی کے لیے عمل وحی کو سمجھانے کی صرف یہی ایک قابلِ قبول صورت ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس طرح نہ صرف وحی کے خالص الٰہی ہونے کی تائید ہوتی ہے، بلکہ اس کا ثبوت بھی بہم پہنچایا جا سکتا ہے محض اس حد تک نہیں کہ وحی الہام کی ایک شکل ہے، بلکہ یہ کہ وحی خاص باللفظ بھی ہوتی ہے۔

(۱۵)۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا۔ اس کی روشنی میں میں اس امر کا دُہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، جو رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بذریعہ وحی نازل ہوا۔ میرا اس پر ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی باللفظ ہوئی، اور یہ وحی اللہ تعالیٰ کی آخری وحی تھی، جو آپؐ پر نازل کی گئی۔ اس عقیدے کے بغیر کوئی مسلمان نام کا مسلمان بھی نہیں ہو سکتا۔

(۱۶) یقیناً یہ بڑی دُکھ کی بات ہے کہ وحی کی تعبیر و تشریح کے سلسلے میں میں نے جو دلائل دیے، اور جن کی کہ بنیاد شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار و آراء تھے، اُن کے خلاف بعض مخصوص حلقوں میں اس طرح کا ناقابلِ فہم ردِ عمل ہوا۔ یہ تو میں واضح طور پر جانتا ہوں کہ بعض افراد اور گروہ جان بوجھ

کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں گرد و غبار کا ایک طوفان کھڑا کیا جا رہا ہے تاکہ لوگوں کی نظروں سے اصل مسئلے کو اوجھل کر کے اور اسے اُلجھا کر اپنی دوسری اغراض پوری کی جائیں۔ میری رائے میں یہ رجحان ایک نہایت ہی تشویش ناک صورتِ حال کا پتہ دیتا ہے۔ ہر قسم کی اصلاح و ترقی کے دشمن حلقے جو اس بحث کی آڑ میں جان بوجھ کر انتشار کو ہوا دے رہے ہیں، یہ ایک کھلا چیلنج ہے ہمارے عقلی، صحت مند اور روحانی و معنوی خلوص کے لئے۔ اقبالؒ نے مولانا رومیؒ کی زبان سے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جو قوم غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کی قوت کھو دیتی ہے اور اصل حقائق کو صحیح طرح نہیں سمجھتی، وہ زوال کی طرف بہت دُور جا چکی ہوتی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ہر ہلاک اُمتِ پیشیں کہ بُود
زانکہ بر جندل گماں بردند عُود

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ اوّلین فرض ہے کہ ہم اپنے اندر ذہنی اور روحانی قوتِ تمیز و فیصلہ پیدا کریں۔ قرآن بار بار اور بڑی شد و مد سے اس ضرورت پر زور دیتا ہے کہ چیزوں کو صحیح عقلی سوجھ بوجھ سے سمجھا اور پرکھا جائے۔

(۱۷) بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے نازک و دقیق عقلی مسائل کو کھلے بندوں عام لوگوں کے سامنے زیرِ بحث نہ لانا چاہیئے۔ اُن پر نہ تو کچھ لکھا جائے، اور نہ ان کے بارے میں گفت گو کی جائے۔ کیونکہ "عام آدمی" میں اتنی عقلی صلاحیت نہیں کہ انہیں سمجھ سکے اور اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکے۔ اس طرح وہ خواہ مخواہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا خطرناک استدلال ہے، اور اس سے براہِ راست معاشرے میں منافقت کو تقویت ملتی ہے۔ عہدِ گزشتہ میں جب چھاپے خانے نہیں تھے، ہمارے بعض نامور بزرگوں نے (مثال کے طور پر امام غزالیؒ نے) ایسی کتابیں لکھیں، جو عوام کے لئے نہیں تھیں۔ بلکہ وہ صرف خواص کے لئے لکھی گئیں۔ یہ طریقہ مفید تھا یا غیر مفید، بہر حال اِس زمانے میں تو یہ بات سرے سے ہے ہی ناقابلِ عمل۔

میری رائے میں تو صرف اخلاقی بنیادوں پر ہی اِس طرح کے طرزِ عمل کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہی وہ طرزِ عمل ہے، جسے بعض بڑے صاحبِ عقل و دانش ہندوؤں نے اپنا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر جب اُن کو توحید کے مسئلے میں قائل کر لیا جاتا ہے، تو وہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ بے شک توحید ہی صحیح عقیدہ ہے،

لیکن اس کے ساتھ ہی اُن کا یہ اصرار ہوتا ہے کہ چونکہ عام آدمی ایک قادرِ مطلق خدا کو نہیں سمجھ سکتا، اس لئے عام آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بتوں کو اُس کے لئے واسطہ بنائے۔ اسی طرح جب عیسائیت کے مقابلے میں یونانیت کے قدم اُکھڑنے لگے تو یونانیت کے عذرخواہ حمایتی اپنی بُت پرستی کے دفاع میں بالکل یہی دلیل دیا کرتے تھے۔

اسلام جمہور کا دین ہے۔ اس نے برہمنیت اور عقل و دانش کے مدعی طبقے کے تمام مخصوص اختیارات و دعاوی مسترد کر دیئے تھے۔ اسلام کی تعلیمات صرف دانش وروں کے لئے مختص نہیں، بلکہ وہ پوری نوعِ انسان کے لئے ہیں۔ اگر ایک شخص کو ایک سچائی پر یقین ہو جاتا ہے، تو پھر اُس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اُسے کھلے طور پر بیان کرے۔ (اصل انگریزی ترجمہ محمد سرور)

"فکر و نظر" بابت اگست ۶۸ء کے "نظرات" میں ہم نے "تفسیر التقریب القرآن" پر جماعت اسلامی ہند کے ماہنامہ "زندگی" کے تبصرہ کا ذکر کیا تھا۔ یہ تفسیر "(مولانا) عبدالوہاب خان رام پوری" کے نام سے چھپی ہے۔ اور اُن کے چھوٹے بھائی "محمد عبدالسلام پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور" کی طرف سے "مسودہ میں کافی حذف و اثبات کے ساتھ" شائع کی گئی ہے۔

جماعتِ اسلامی ہند کے ترجمان نے اِن دو بھائیوں کا تعارف یوں کرایا تھا: "محترم و مکرم مولانا عبدالوہاب خان صاحب دام اللہ لقابہ، اس وقت رام پور کے متبحر اور متقی علماء میں بہت اُونچے مقام پر فائز ہیں۔ اور یہاں کی چند گنی چنی شخصیتوں میں سے ایک اہم شخصیت ہیں۔ اور اُن کے چھوٹے بھائی محترم مولانا عبدالسلام صاحب پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور اپنی ذہانت اور علم و فضل میں بہت نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔۔۔۔۔" ــــــــــ حُسنِ اتفاق سے کتاب "تفسیر التقریب القرآن" ہمیں ابھی ملی ہے۔ اس میں سے ایک اقتباس جو مذکورہ بالا زیرِ بحث موضوع سے تعلق رکھتا ہے، یہاں دیا جا رہا ہے۔ خود کتاب پر بعد میں مفصل تبصرہ کیا جائے گا۔ (مدیر)

"اھدنا الصراط المستقیم" کی تفسیر کے حاشیے میں "ھدایت" پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:۔

"ھدایۃ کے معنی رستہ دکھا دینا یا اس رستے پر ڈال دینا جو منزل پر پہنچا دے، قرآن نے دونوں مفہوموں میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ یوں تو طبیعت[۱]، جبلت[۲] اور عقل[۳] سب ہی اپنی اپنی جگہ ہدایت کا کام انجام

دیتے ہیں۔ طبیعت اور جبلّت قدرت کے بندھے ٹکے نظام عمل پر چیزوں کو ڈالے رکھتی ہے۔ عقل کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے مخصوص اصناف اور پھر افراد کے مناسب اختیار و ارادہ کی بھی اہمیت ہے .... بہر حال ہدایت کی یہ نوع خواہ وہ طبیعت کی ہو یا جبلّت وعقل کی، ربوبیتِ عامہ کا ہی ایک حصہ ہے۔ اور ربوبیت کے عموم کے مطابق یہ بھی محل و موضوع کی خصوصیات کے موافق عام .... طبیعت اور جبلّت کی ہدایتیں وجود اور بقاء کے نقطۂ نظر سے کافی اہم سہی، لیکن ارادی نشوونما اور شعوری تکمیل وارتقاء کے اعتبار سے اُن کا میدانِ عمل زیادہ پھیلا ہوا نہیں۔ عقل کی ہدایت باوجود اس کی غیر معمولی افادیت اور دائرہ عمل کی کافی وسعت کے، محدود ہے۔ اس لئے کہ خود عقل کی خاص حدیں ہیں، کائنات کے آخری سبب کی نوعیت اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت اور پھر اس کی خصوصیات، اپنے ماحول اور ظروف سے انسان کا رشتہ اور اس رشتے کی بنیاد پر اُس کے فرائض و اعمال اور پھر انسانی حیات پر ان فرائض و اعمال کے اثرات اور خود انسانی حیات کے ماوراء الحس تغیرات اور اُن کا باہم ربط۔ غرض یہ اور اس طرح کے بہت سے مسائل عقل کی حدودِ ہدایت سے خارج ہوتے ہوئے بھی بنیاد ہیں، اس کی سیرت کی اساس ہیں خود اُس کے انحطاط اور ارتقاء کی، اور نقطۂ آغاز ہیں اس کی اور ماحول و ظروف کی متوافق اور ہم رنگ تشکیل کی۔

چنانچہ قدرت نے اس باب میں بھی بُخل نہیں کیا۔ اور اس کی عملی ہدایت کے لئے ایک باطنی وقوف اور خود آشکار شعور دیا۔ انسان جس طرح اپنی ہستی کو محسوس کرتا ہے، جس طرح ماحول و ظروف کی ہستی کو مانتا ہے، اسی طرح یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کائناتی ہستی کے ماوراء کوئی بالادست ہستی ہے، جو اس پوری کارگاہِ وجود کی خالق اور مدبّر ہے۔ زشت و خوب زندگی میں اپنی مستقل اور قائم قیمت رکھتے ہیں۔ اعمال وافعال کے عواقب ہیں، جو انہی زشت و خوب کے تحت تشکیل پاتے ہیں۔ پھر اظہارِ ذات کی اندرونی تڑپ، مختلف طاقتوں کی تسخیر کا باطنی تقاضا، یہ سب اس کی ہستی اور اس کے شعور کی ساخت کے گویا لوازم ہیں، جن کو اگر بہ تکلف دبا دیا گیا ہے تو انسانی سیرت کی تاریخ گواہ ہے کہ موقع ملتے ہی یہ ماورائی شعور بیدار ہوا۔ انسان کا یہ باطنی شعور اور اُس کی ہستی کے یہ داخلی تقاضے ایک طرح کی وجدانی ہدایت ہے، جو سب انسانوں کا حصہ ہے .... یہ ہدایت جو بلاتخصیص انسانیت کا جوہر ہے، اجمالی اور اُصولی ہے۔

یہی خلقی وجدان یا باطنی اور اندر سے پھوٹنے والا وقوف و شعور جس کا براہِ راست تجربہ عام انسانی

مشاہدہ ہے۔ افراد کی صلاحیتوں کے فرق سے اپنی داخلی حیثیت میں کم و بیش واضح اور مبہم یا مجمل اور مفصل نیز اپنے احاطۂ اثر کے اعتبار سے خالص شخصی سے قومی اور اقوامی حدود تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ قوت کے اعتبار سے ہلکے خیال سے نہایت مستحکم اور رگ و ریشے میں ساری ایمان و ایقان تک بڑھ جاتا ہے۔ اور دوسرے احساسات اور جذبات کے قیاس پر ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔

بعض خاص خاص صلاحیتوں والے افراد کا یہ باطنی شہود بہت زیادہ واضح اور بہت زیادہ مفصل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جزئیات اور تفاصیل تک کو محسوس کر لیتے ہیں۔ پیش آمدہ حالات سے نپٹنے کے لئے اصول کے ساتھ فروع اور اُن کے اطلاق کی نوعیت اور اُن کے نتائج کا بھی مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اُن کے یہ داخلی تجربے اور باطنی مشاہدے اپنی قوت اور دباؤ کے اعتبار سے زندگی کے سب سے بڑے عامل اور محرک ثابت ہوتے ہیں۔ اور اپنے حلقۂ اثر کے اعتبار سے اہم معاشرتی قیمت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ زندگیوں کا رُخ پلٹ دیتے اور تاریخ کے دھارے پھیر دیتے ہیں، بلکہ معاشرے کو نئے محرک اور نئے معیار دے دیتے ہیں۔ اور اُس کی ایک مستقل اور تابناک تاریخ بنا جاتے ہیں۔

اُن کا یہ داخلی شعور اور یہ باطنی فعالیت یا اندر سے پھوٹنے والا عامل اور محرک عام انسانی وجدان اور شعور کی اور اُن کے عام داخلی محرک کی ہی قوی صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انسانیت کے مشترک اندرونی مطالبوں کا کھلا جواب ہوتے ہیں۔ اور اس لئے اپنے اجزاء کے اعتبار سے متوازن، متوافق اور ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ظروف و ماحول میں اصلاح کر کے اور متخالف و متحارب طاقتوں کو تسخیر کر کے عام توافق اور یکرنگی کی نشوونما کرتے ہیں۔ اور ایک طرح سے اُن کی یہی خصوصیت معیار ہوتی ہے اُن کی صحت و صداقت کی۔ اگر کوئی خاص گروہ یا قوم اپنی ضد یا ہٹ دھرمی سے اُن کے اس باطنی شعور کی ہدایت نہیں مانتا، تو دوسرے گروہ اور دوسری قومیں اُسے قبول کرتی ہیں۔ ذالک ھُدی اللّٰہ یھدی بہ من یشاء من عبادہ ولو اشرکوا لحبط منھم ما کانوا یعملون ٥ اولئکَ الّذین اٰتینا ھم الکتاب والحکم والنبوۃ فان یکفر بھا ھولاء فقد وکلنا بھا قوما لیسوا بھا بکٰفرین ٥ اولئکَ الّذین ھدی اللّٰہ فبھدا ھم اقتدہ ٥

یہ برگزیدہ افراد نہ کسی ایک قوم اور ایک ملک کا ورثہ ہوتے ہیں اور نہ کسی خاص جماعت اور خاص علاقے میں منحصر۔ "لِکُلِّ قومٍ ھادٍ" اور "ولکلِّ اُمّۃٍ رسول" سے اشارہ غالباً ایسے ہی محسنوں کی طرف ہے۔ ان لوگوں کے احساسات اور اعمال میں مشترک انسانیت کے لئے تڑپ ہوتی ہے۔ اور عالمگیر جذبہ محبت موجزن ہوتا ہے۔

ہدایت کی یہ تیسری صورت ہے جس کو ہدایت نبوت یا ہدایت وحی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہدایت وحی کا حلقۂ افادیت خاص قوم اور خاص علاقہ بھی ہو سکتا ہے اور عام انسانیت بھی تاہم اس کے براہ راست حامل اور موضوع خصوصی صلاحیتوں والے ہی ہوتے ہیں۔ اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ۔

چونکہ یہ ہدایت عام سچائیوں اور زندگی کی مستقل اور مشترک قدروں پر قائم ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے اجمال اور اصول میں یکساں ہوتی ہے، جس کو زمان اور مکان کی احاطہ بندیاں پارہ پارہ نہیں کرتیں۔ ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللّٰہ واجتنبوا الطاغوت۔ ہاں اپنے اطلاق اور جزئیات وفروع کے اعتبار سے قوموں، ملکوں اور عہدوں کے اختلاف وتفاوت سے ان میں اندرونی اصلاح وترمیم ہوتی رہتی ہے لکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجا۔ ——————

آیت کریمہ تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعضٍ منھم من کلّم اللّٰہ" کی تفسیر کے تحت یہ حاشیہ ہے:۔

"اللہ تعالیٰ کی اس خصوصی ہم کلامی کی کیفیت اور سننے والوں کی سماعت کی نوعیت کو محسوس کر لینا اللہ تعالیٰ کے انہیں برگزیدہ بندوں کا کام ہے، جن کو یہ شرف عطا کیا گیا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے نابینا سے بینائی کی کیفیت کے احساس کی توقع۔ سلف کا محفوظ طریقہ ایسے امور میں اُن کی اصلیت پر ایمان اور کیفیت کے مجہول ہونے کا اعتراف ہے۔ آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص صلاحیت واستعداد یا فعلیت کو اصل فطرت میں ودیعت کر دینے کے علاوہ وحی وکلام کی خصوصی صورتیں دو ہیں:۔

تکلم وراء حجاب، جس میں القاء فی القلب خواہ بیداری میں ہو یا خواب میں شامل ہے۔ وحی خفی یا وحی غیر متلو بھی القاء فی القلب میں داخل ہے۔

وحی بواسطہ ملک، اس میں کبھی فرشتہ ظاہر اور متشکل ہو کر کلام الٰہی پہنچاتا ہے اور کبھی بغیر متشکل ہوئے۔ جس کا انداز صلصلۃ جرس جیسا ہوتا ہے ...."

"پیش لفظ" میں لکھا ہے:۔

"قرآن مجید یوں تو عربی مبین اور کھلی صاف عربی میں ہے۔ اگر قرآنی بیان کا اُس عہد کے نثر ونظم کے نمونوں سے مقابلہ کیا جائے، تو اس دعوے کی صداقت اور واضح ہو جاتی ہے۔ تاہم قریب قریب ہر زمانے میں قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو کچھ نہ کچھ مشکلاتِ قرآن کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ مشکلات کچھ تو واقعاتی ہیں جو متعلقہ واقعات اور حالات یا اس گرد وپیش کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جن میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اور کچھ تشریحی اور تفسیری ہیں یعنی لفظوں،

(باقی صفحہ ۲۲۵ پر)